بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

تاریخ درسگاہِ حکمت اسی لیے ہے کہ وہ آئینہ دارِ عبرت ہے!

پوری کائنات خدا کی سلطنت ہے، اور جس طرح اس کے سنن و نوامیس اس سلطنت کے جمادی، نباتی حیوانی موجودات پر حاوی ہیں، اسی طرح انسانی زندگی بھی خواہ وہ فرد کی ہو یا معاشرے کی، اسی کی تقدیرات اور اسی کے ضوابط میں جکڑی ہوئی ہے۔

ان بے لاگ قوانین کے تحت کوئی جامد اور کمزور قوم یکایک سر اُبھارتی ہے اور دوسری طرف کسی طنطنہ دار قوم کا حال ویسا ہو جاتا ہے جیسے کوئی قصرِ رفیع الشان کھنڈروں میں بدل جائے۔ کوئی تہذیب عروج پر آتی ہے، اور کوئی پہلے سے تسلط یافتہ تہذیب جڑ بنیاد سے اُکھڑ جاتی ہے۔ کوئی شخص بوریا سے اُٹھتا ہے اور تخت نشین ہو جاتا ہے اور کسی دوسرے کے سر سے قدرت تاج نوچتی ہے تو سر بھی اس کے ساتھ زمین پر آگرتا ہے۔ پوری تاریخ عظمتوں کا ایک قبرستان ہے۔ یہاں کبھی فرعون بھی تھا جس نے کہا تھا انا ربکم الاعلیٰ۔ یہاں نمرود بھی ہو گذرا ہے جس نے شانِ استکبار سے کہا تھا انا احیی و اُمیت۔ یہاں چنگیز و ہلاکو بھی تلواریں لہرا چکے ہیں، جنہوں نے شہروں کو مقتل بنا دیا تھا، خون کے دریا بہائے، علم کے چراغ گُل کیے اور عصمتوں کے گلشن تاراج کیے۔ یہاں کبھی ہٹلر کا مکہ ہوا میں لہراتا تھا اور مسولینی کی صیادوں جیسی نگاہیں دل و جگر سے گذر جایا کرتی تھیں۔ خود ہماری تاریخ میں یزید، شمر، حجاج بن یوسف اور ابن ہبیرہ جیسی خونخوار ہستیاں بھی گزری ہیں۔ پھر قریب کے دور میں دیکھیں تو مصطفےٰ کمال اور ناصر کا ڈنکا بجتا ہم نے دیکھا، مگر وہ جب اپنے مخالفِ دین ظالمانہ اعمال کی زد میں آئے تو رنگ کچھ اور ہو گیا۔ سرزمین پاکستان کیسے فراموش کر سکتی ہے غلام محمد اور سکندر مرزا اور صدر ایوب اور صدر یحییٰ کے ادوار کو

جب کہ ان لوگوں کے تخت ہمارے سروں پر بچھے تھے اور گردن ہلانا اور دم مارنا ممکن نہ تھا۔ لیکن انہیں اعزاز و اکرام کے اسٹیج سے سنن الٰہیہ نے دھکیل کر اس طرح پیچھے گرا دیا ہے کہ کوئی اُدھر مڑ کر دیکھتا بھی نہیں۔

شروع سے اب تک اسی طرح ہوتا آیا ہے، مگر ایسے لوگ کم نکلے جو تاریخ کے پچھلے واقعات سے عبرت کا درس لے سکتے۔ اور اس دُنیوی زندگی میں اقتدار کی آزمائش سے ہمیشہ کے لیے سُرخرو ہو کر نکلتے۔ اقتدار سب سے بڑا اعزاز اور ذریعۂ شہرت بھی ہے، اور اقتدار ہی سب سے بڑا سامانِ ذلت بھی۔ خدا کے رسولؐ نے کیا ہی صحیح فرمایا کہ اقتدار اللہ تعالیٰ کا ایک سایہ ہے اور جس کے حصے میں یہ آئے، اُس نے اگر اس کی توہین کی تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی ذلت سے دوچار کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں اقتدار خدا کی طرف سے ایک گراں بہا امانت ہے۔ اور جو شخص اقتدار کی قوت کو استعمال کرنے میں خیانت کرتا ہے، اس کے اصل مالک کی مرضی سے بغاوت کر کے اُسے حصولِ مفاد اور دوسروں پر ظلم کرنے کا ذریعہ بناتا ہے تو وہ گویا اللہ کی معزز امانت کی توہین کرتا ہے۔ امانتِ اقتدار کی توہین کرنے والوں کو جس اُخروی انجام سے دوچار ہونا ہے وہ تو پیش آئے گا ہی، بالعموم اس دنیا میں ہی اللہ کا غضب و انتقام ایک ہلکی سی جھلک دکھا دیتا ہے۔

ہمارے درمیان ایک شخص اُٹھا اور اُس نے کہا کہ "میں پاکستان کے سب حکمرانوں سے زیادہ دیر تک حکومت کروں گا"۔ اس نے متعدد بار سیاسی یا صحافیانہ دائروں میں اختلاف کرنے والوں کو دھمکایا کہ میں "فکس اَپ کر دوں گا"، یہاں تک کہ کچھ دنوں تک کے لیے یہ الفاظ زدِ عام ہو گئے۔ اُس نے کئی معاملوں میں کہا کہ یوں ہو گا، "ورنہ پھر دما دم مست قلندر!" انتخابات ۱۹۷۰ء کے بعد جب قومی اسمبلی کے اوّلین اجلاس کا انعقاد مشرقی پاکستان میں کرنے کا اعلان ہوا تو اُس نے کہا کہ مغربی پاکستان سے اگر کوئی شخص اُس میں شرکت کے لیے جائے گا تو اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اور اس نے انتخابات مارچ ۱۹۷۷ء کے بعد تناؤ کے ساتھ کہا کہ انتخابات دوبارہ نہیں کرائے جا سکتے۔ انتخابی دھاندلی کے خلاف عوام کے احتجاجی مظاہروں کو روکنے کے لیے جب گولیاں برس رہی تھیں تو اُس نے کہا کہ "میری کرسی بڑی مضبوط ہے"۔

لیکن ۵ رجولائی کو وہ مضبوط کرسی اُلٹ گئی اور "چیئرمین" صاحب قلعے کے سے حفاظتی انتظامات میں

گھر سے ہوتے قصرِ وزارت سے نکل کر خارزارِ حراست میں جا پہنچے۔ یا اللہ، برحق ہے کہ تعز من تشاء و تذل من تشاء!

یاد کیجیے اس شخص کی چالاکیاں، اس کی جبر کیشیاں، اس کی تیزیاں اور طراریاں، اس کے کرائے ہوئے قتل اور اغوا، اس کا قائم کردہ غیر قانونی جیل دولائی کیمپ، اس کے سجائے ہوئے بنگلے اور مہمان خانے، اس کے عشرت کدوں میں خم لنڈھانے اور عصمتیں برباد کرنے کے انتظامات، قومی خزانے کا بے رحمانہ استعمال، اقتصادیات کی بربادی کے اقدامات، عہدوں کا اپنے حامیوں اور خوشامدیوں میں بٹوارہ، لائسنسوں، پرمٹوں اور راشن ڈپوؤں کی سیاسی بنیادوں پر تقسیم، بلوچستان سے عورتوں کا پردہ ختم کرانے کی تحریک کا آغاز، ذرائع ابلاغ کا اپنے اور اپنی پارٹی کے حق میں پروپیگنڈا کرانے کا بھرپور استعمال، انتخابات ۱۹۷۷ء میں سرکاری ملازمین کے تعاون سے دنیا بھر کی سب سے بڑی دھاندلی، دھاندلی کے خلاف اُٹھنے والے ایجی ٹیشن میں سیاسی لیڈروں اور ورکروں، ججوں اور وکیلوں، علماء اور طلباء اور پردہ دار خواتین کے خلاف اندھا دھند لاٹھیوں، گیس اور گولیوں کی بوچھاڑیں، شاہی قلعے اور سی۔آئی۔اے اور دفتروں اور تھانوں میں گرفتار لوگوں پر وحشیانہ تشدد، عدالتوں کو درکنار رکھ کر ٹربیونلوں کے ذریعے سیاست کاروں اور صحافیوں کو سزا دہی، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اپنی بہادر فوج کو مشرقی پاکستان میں ذلت آمیز شکست سے دوچار کرانے اور نوّے ہزار افراد کو بھارت کا قیدی بنوانے کا کارنامہ۔ پھر انہی قیدیوں کو چھڑانے کے لیے شملہ معاہدے کا شاخسانہ، مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنوانے میں مؤثر پارٹ، فوج کو مجبور کر کے بلوچستان پر چڑھائی کرانا، جرائم پیشہ اور غنڈہ افراد کو سیاسی میدان میں لا کر معاشرے کے شرفا کو گھٹیا عناصر کے سامنے بے بس کر دینا، تعلیم یافتہ طبقے کے مقابلے میں اَن پڑھ عوام کو روٹی کپڑے مکان کے نعرے سے مست کر کے صف آرا کرنا، قوم کے نونہالوں کو سڑکوں پہ ننگا کر کے پٹوانا، اسلامی سوشلزم کے لایعنی سلوگن کو فروغ دے کر قوم میں فکری بحران پیدا کرنا، کرائے کے سامعین کو بُلا کر جلسوں جلوسوں کی رونق بڑھانا ــ جس شخص کی داستانِ قیادت کے یہ ابواب ہوں، قدرت اُسے آخر کہاں تک ڈھیل دیتی۔

کیا ہی ایکٹنگ کی شان تھی اس شخص کی اُس دن جب ایک بیرونی دَورے سے (غالباً افغانستان یا ایران سے) واپس آنے پر اُسے بتایا گیا کہ ڈاکٹر نذیر کو قتل کر دیا گیا ہے تو یہ شخص قومی اسمبلی کے لیے جماعت اسلامی کی منتخب شدہ اس نمایاں شخصیت کے متعلق نادان بن کر پوچھتا ہے: 'WHO WAS THIS GENTLEMAN'

یعنی یہ بھلا آدمی کون تھا؟ اُس سے یہ نہ ہو سکا کہ اس اطلاع کو سن کر یہ کہتا کہ بڑا افسوسناک واقعہ ہے، یا کہتا کہ اس کی فوری تحقیقات ہونی چاہیے اور قاتلوں کو پکڑ کر سزا دلوانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ بھٹو صاحب سے اگر کسی مقتول کی خبر بیان کی جا رہی تھی تو اُس کی کوئی اہمیت تھی۔ ان کی مشکل شاید یہ رہی ہوگی کہ اپنے بے شمار قتیلانِ ناز میں سے کس کس کو جانیں ـــــ ڈاکٹر نذیر، خواجہ رفیق، مولوی شمس الدین، عبدالصمد اچکزئی، ضامن علی، نواب محمد احمد خاں ـــــ بیچارے یہی پوچھ کر رہ گئے کہ ؎

یہ کون تھا ؟ کس کا خون بہا ؟

کتنی ہی شہ رگوں کا خون اور کتنی ہی آنکھوں کے آنسو اور کتنے ہی ہونٹوں کی آہیں اور کتنے ہی دلوں کی بددعائیں بھٹو صاحب کے پیمانۂ مقدر میں بھرتی چلی گئیں، یہاں تک کہ پیمانہ چھلک گیا۔ یہ وقت جب آجاتا ہے تو پھر قاعدہ یہی ہے کہ لا یستاخرون منہ ساعۃً ولا یستقدمون۔ رات کو نشۂ اقتدار میں حسبِ معمول شیرِ ژیاں تھے، صبح ہوئی تو نشہ ہرن ہو گیا اور شیر قالین بھی نہ رہے، کیونکہ قالین ہی باقی نہ تھا ؎

جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

میں نے گردشِ ایام کا یہ شعبدہ دیکھا تو ایک لحظہ کے لیے لمحۂ فکریہ مجھ پر طاری ہو گیا۔ میں سوچتا رہا کہ ایک شخص کی ہفت رنگ ذہانت، اس کی ساحری، اس کی بازی گری، اس کے ملکی اور بین الاقوامی تعلقات، انگریزی، اُردو اور سندھی میں طلاقتِ لسانی، اقتدار کے محل میں رہ کر بڑے درجے کی سیاست کاری کے براہ راست تجربات و مشاہدات، ۱۹۶۵ء سے تخت تک پہنچنے کے دُور رس منصوبوں پر کام کرتے ہوئے طرح طرح کے جوڑ توڑ، اُوپر محلاتی سازش میں حصہ داری اور نیچے عوام میں انتخابی معرکہ آرائی ـــــ اس ساری تگ و تاز کا حاصل بس یہی چار چھ برس کی فرماں روائی، اور اس کے بعد طرح طرح کے سیاسی و اخلاقی، اور ذاتی و قومی جرائم کے انبار تلے دب کر رہ جانا! آخر ایسا کیوں ہوا؟

اعماقِ دل سے جواب ملا کہ بندہ ہوتے ہوئے خدا سے بے نیازی، اس کے بندوں کی بہت بڑی خدمت کی ذمہ داری کندھوں پر لینے کے بعد اُلٹا عوام کو فسطائیت کی چکی میں پیس دینا، لوگوں کے دلوں کو ہاتھ میں لینے کے بجائے یا تو انہیں مغالطوں اور خوش فہمیوں میں ڈال کر ساتھ گھسیٹنا، یا پھر ان کو جبریت اور تذلیل و تحقیر کا نشانہ بنانا، جھوٹ کی ریتلی بنیادوں پر پروپیگنڈے کے حفاظتی قلعے کھڑے کرنا، اسلام کا نام لے لے کر اسلام کو جراحتیں پہنچانا اور احیائے اسلام کا راستہ روکنے کے لیے ایسی جزوی، سرسری اور نمائشی

کارروائیاں کرنا جن سے عوام کے دل پہلے رہیں اور برادر مسلم ممالک اچھی توقعات وابستہ کریں، اپنی تمام سرگرمیوں میں تضادات بھر دینا، یہ تھے وہ وجوہ جن سے بیس سال کی تیاریاں کر کے حکمرانی پانے والا ایک شخص مدتِ تیاری کے ایک چوتھائی حصے میں محل سے دھکیل کر باہر کر دیا گیا، اور باہر بھی اب قوم اس کے لیے پھولوں کے ہار لیے نہیں کھڑی ہے کہ اس کی زریں خدمات کی تحسین تو باقی ہے۔

چند اہل مفاد اور نافہم عقیدتمندوں کا قصیدے پڑھنا اور چیز ہے، اور قوم کے مجموعی مزاج کا ردِ عمل اور چیز۔

مگر جس طرح اقتدار پہ آکر آدمی برخود غلط ہونے کی وجہ سے خود ہی اپنی محرومیٔ اقتدار کے سامان کرتا ہے، اسی طرح اقتدار سے الگ ہونے پر وہ ایک اور طرح کے مغالطے میں پڑ کر یہ سمجھتا ہے کہ جو بازی ہر گئی ہے اُسے وہ دوبارہ جیت لے گا۔ اور اس مغالطے کے تحت جو مساعی وہ کرتا ہے وہ اسے اور خراب کرتی ہے۔ بلکہ ایک مفروضہ کے طور پہ آج اگر بھٹو صاحب کو پھر تخت نشین کر دیا جائے تو وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر ظلم اور جھوٹ سے کام لیں گے اور پہلے سے زیادہ بڑی رسوائی کے ساتھ برطرف کیے جائیں گے۔ کاش کہ وہ اپنی غلطیوں اور حالات کی ناسازگاریوں اور قومی رجحانات کی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں۔

انسانوں کی اکثریت کی مشکل یہی ہے کہ وہ نہ تاریخ سے سبق لیتے ہیں، نہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرتے ہیں، اور نہ بدلے ہوئے حالات کے تیور پہچانتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی سوراخ سے دس دس بار ڈسے جاتے ہیں۔

بھٹو صاحب یا دوسرے لوگ جو کچھ بھی سوچتے ہوں، میری سوچ و بچار کا ماحصل یہی ہے کہ میں خدائے قیوم و قدوس کے سامنے سرافگندہ ہو کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اے اللہ تمام کائنات تیری سلطنت ہے، تمام انسان تیرے بندے ہیں۔ تمام افراد و اقوام پر تیرا بے لاگ قانون نافذ ہے، تو چاہے تو ریگزاروں میں لالہ و گل کھلا دے اور چاہے تو عالیشان آبادیوں کا خاکہ اڑا دے۔ تیرا اشارہ ہو تو کوئی گدائے بے نوا سربراہِ سلطنت ہو سکتا ہے اور تو چاہے تو کسی آقائے ولی نعمت کو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دے یا پھانسی کے تختے پر پہنچا دے۔ اے مالک الملک! مجھے بھٹو صاحب سے کوئی ذاتی نفرت نہیں ہے، کسی شخصی معاملے میں میں اپنے اندر ان کے لیے کوئی خواہش انتقام نہیں رکھتا، کوئی اندھا جذبہ مجھ میں ایسا نہیں ہے کہ ان کو مصیبت میں دیکھ کر مجھے تفریح حاصل ہو۔ میرے لیے اُن کی غلطیاں بھی باعثِ رنج

تھیں، اور اب ان کے حق میں غلطیوں کے جو نتائج نکل رہے ہیں، ان پر بھی ویسا ہی ملال ہے، جیسا کسی زہر کھا لینے والے کی کشمکشِ موت و حیات کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ البتہ انہوں نے پاکستان جیسی پیاری مملکت کے اندر بسنے والی قوم کو سیاسی، اخلاقی، معاشی، ثقافتی اور فکری لحاظ سے جس بُری طرح تباہ کیا ہے اس کا تلخ احساس کسی بھی محبِ دین اور خادمِ ملت فرد کی طرح میری روح سے کبھی الگ نہیں ہوتا۔ قوم نے غلام محمد، سکندر مرزا، صدر ایوب اور محمد یحییٰ کے ادوار کے مقابلے میں بھٹو دور میں کئی گنا زیادہ چرکے کھائے ہیں۔ قدرت بھٹو صاحب کے حساب کا کچھ حصہ اس دنیا میں لے لے گی یا نہ لے گی، یہ تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن آخرت میں اُن کو ذرے ذرے، لفظ لفظ، قدم قدم اور پیسے پیسے کا حساب احکم الحاکمین کو دینا ہوگا۔ جبکہ ہزارہا فریادی اُن کو گھیرے ہوئے ہوں گے۔ اور بعض مقدموں میں تو خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدعی ہوں گے۔ ؎

بچتے نہیں، مواخذۂ روزِ حشر سے

وہاں موصوف کے لیے حساب پورا کر دکھانا بھی محال، اور تلافیٔ مافات بھی ناممکن! ــــ باقی انجام صرف خدا ہی جانتا ہے۔

موصوف کو ایک اخلاقی جرم میں ہائی کورٹ سے جو سزا ملی ہے، اس کے خلاف ایک طرف ملک میں مصنوعی طور پر تخریب کاری کا طوفان اُٹھایا گیا (کیونکہ پہلا دن خاموشی سے گذرا تھا)، اور دوسری طرف احتجاج اور درخواستِ رحم کی ایسی شکلیں سامنے آئیں جن میں قانون کی عملداری پر عدم اعتماد اور عدلیہ کی توہین کے پہلو نکلتے تھے۔ رہیں باہر کی رحم کی اپیلیں تو اُن کی حقیقت یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے جو سرکردہ اور غیر نمایاں حضرات ملک سے باہر چلے گئے ہیں وہ جا بجا سارے معاملے کو اپنے رنگ میں پیش کر کے ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ دوسری طرف ہمارے ہاں سے یہ اہتمام بروقت نہ ہو سکا کہ موعودہ قرطاس ابیض کے ذریعے بھٹو صاحب کا پورا کردار دنیا کے سامنے واضح کر دیا جاتا تاکہ وہ ان کے خادم قوم اور حامیٔ دینِ متین اور علمبردار جمہوریت ہونے کی حقیقت کو جان لیتے۔ نیز وہ سمجھ جاتے کہ بات یہ نہیں کہ ایک ملک کے سابق وزیر اعظم سے کوئی اکا دکا جرم سرزد ہو گیا، بلکہ حقیقت یوں ہے کہ ایک ہر جہتی مجرم تھا جو اتفاق سے ملک کے مسندِ اقتدار پر قابض ہو گیا۔

(۲)

آج مملکتِ پاکستان جس مرحلے سے گذر رہی ہے، وہ ترکِ اختلافات کا مرحلہ ہے۔ تاریخ میں کبھی کبھی اسی طرح کے مرحلہ ہائے ایثار آتے ہیں۔ جب کہ تمام مفاد الگ رکھ دینے ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے تشخص کے میناروں کی چُنائی کا کام روک دینا پڑتا ہے اور وزارتوں، انتخابی نشستوں اور اختیارات بلا شرکتِ غیرے کے خواب فراموش کر دیے جاتے ہیں۔

خوش قسمت ہوتی ہے وہ قوم جس کے فکری، دینی اور سیاسی قائدین تاریخ کے بدلتے موسموں کو پہچانتے ہیں اور فضا کا رنگ دیکھ کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ طوفانِ سموم آنے والا ہے یا ہوا کی ایک اشاراتی خوشبو سے سمجھ لیتے ہیں کہ بارانِ رحمت کی آمد آمد ہے، یا پرندوں کی غیر معمولی آوازوں اور جانوروں کی مضطربانہ حرکات سے نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ زلزلہ درپیش ہے۔ اسی طرح کے اہلِ بصیرت جہاں ہوں وہاں وہ بڑی آسانی سے حالات کے اُن مرحلوں کو جان لیتے ہیں جو ترکِ تشخص اور ایثارِ مفاد کے مرحلے ہوتے ہیں اور جبکہ خدمتِ ملک و ملت کی واحد راہ اتحاد اور تعاون کی راہ ہوتی ہے۔ اور اگر اس کینیڈا کے لوگ ہی کسی ملک میں نہ ملیں تو پھر ہر قسم کے بحران نمودار ہو سکتے ہیں اور دریائے وقت کا کوئی بھی جوار بھاٹا پورے سفینے کو ڈبو سکتا ہے۔

یہاں کچھ عجیب صورت حالات ہے۔ ۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کو پاک فوج نے ہمیں پوری تاریخ پاکستان کے سب سے زیادہ تاریک دورِ قاہری و ساحری سے نجات دلائی[1] ملک کے اکابرنے (باقی برصفحہ ۴۵)

[1] آج بعض سیاسی دانشور بڑے جمہوریت نواز بن کر ایسی باتیں کرتے ہیں کہ ہم فلاں صورت اس لیے اختیار نہیں کر سکتے کہ یہ تقاضائے جمہوریت کے خلاف ہے۔ اگر تقاضائے جمہوریت ہی کو اہمیت دی جاتی تو پھر کون سے جمہوری طریق سے آپ گذشتہ لاجمہوری دور سے نجات پاتے۔ غالباً طرزِ فکر یہ ہے کہ جب کبھی غیر جمہوری طریق سے کام لینا ضروری ہو جائے تب تو کوئی اور قوت آکر اس کو ہمارے لیے سرانجام دے دے۔ اور جب وہ سرانجام دے لے تو آپ اس کے قریب سے یہ کہہ کر بھاگیں کہ ہم تو جمہوری لوگ ہیں۔ اور ان جمہوریوں میں وہ بھی ہیں جن کی نہ جماعت سازی اور رکن سازی کسی قرینے قاعدے سے ہوتی ہے۔ نہ لیڈر اور دیگر عہدہ داروں کے باضابطہ جمہوری (باقی برصفحہ ۴۵)

(بقیہ اشارات) اس اقدام کا خیر مقدم کیا، تبریک و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں، مگر فوج کی نئی حکومت جس پر اُن کے اندازوں سے زیادہ بھاری بوجھ آ پڑا تھا اور جسے سیاسی معاملات، انتظامی پیچیدگیوں اور عوامی مسائل کا کوئی عملی تجربہ پہلے سے نہ تھا، اس کے ساتھ اکابر دین و سیاست نے پہلے متذبذبانہ اور پھر محتاط طرزِ عمل اختیار کیا، اور مزید آگے چلنے کے بعد اپنے آپ کو حکومت سے ایک مناسب فاصلے پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگر محبتِ دین و وطن پر مبنی بصیرت پوری طرح کام کر رہی ہوتی تو یہ لوگ سوچتے کہ اگر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے پہلے والے حالات ہی آگے چلتے اور انہی کے تحت انتخابات ہوتے تو ہزار سمجھوتوں کے باوجود کیا نتائج برآمد ہوتے؟ اور جو نتائج برآمد ہوتے اُن کے زیرِ اثر پاکستان میں ملک و دین کا مقدر کیا ہوتا، سیاسی اختلافات کرنے والوں کو فسطائیت کا چوٹ کھایا ہوا اژدر کس سلوک سے نوازتا۔ اور اسی طرح کاش کہ یہ حضرات یہ بھی سوچتے کہ اگر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو موجودہ قوت کے بجائے کسی اور نقطۂ نظر کے لوگ غالب آئے ہوتے تو آج حالات کیا ہوتے، خود ان لیڈروں کو کیا تجربات پیش آتے، حکومت کی انتظامی عملداری کیا شکل اختیار کرتی، اور ایسے کسی گروپ کے اہتمام سے ہونے والے انتخابات کا رُخ کیا ہوتا۔ اور اب اگر آپ بے نیازی اور بے تعلقی کی روش اختیار کر کے موجودہ حکومت کو اندرونی تخریبی عناصر اور بیرونی سازشی قوتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پیچیدگی و ثرولیدگی کے اس مرحلے تک پہنچا دیں جس پر پہنچ کر مرحوم صدر ایوب اور بعد میں صدر یحییٰ نے محل سے بھاگتے بھاگتے اقتدار کا تاج کسی بھی جھولی میں جلد سے جلد پھینک دیا، اور ملک کو تقدیر کے حوالے کر دیا گیا تو پھر آپ کی کوتاہی کا کفارہ کیسے ادا ہوگا؟

بدقسمتی سے جس اعلیٰ درجے کی بصیرت مندی اور اس کے تحت جس ایثارِ مفاد و تشخص کی ضرورت تھی، اس کی کوتاہی کی حد یہ سامنے آئی کہ حکومت سے تعاون کرنے کا معاملہ تو الگ رہا، جو رہنمایانِ قوم مل کے

(بقیہ حاشیہ) انتخابات ہوتے ہیں اور نہ سارے فیصلوں اور کارروائیوں میں جمہوری طرز کا انضباط پایا جاتا ہے کبھی کبھی تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ کوئی صاحب جمہوریت کا ورد کرتے کرتے جب کرسیٔ اقتدار تک پہنچ جائیں تو شاید وہ ایک نئی شان کے ڈکٹیٹر ثابت ہوں۔

کام کر رہے تھے خود وہ اپنے ہی باہمی اتحاد کو جاری نہ رکھ سکے۔ جب تک اتحاد کا ظاہری ڈھانچہ برقرار تھا تو بیانوں اور مطالبوں کی رنگا رنگی اضطراب پھیلاتی رہی۔ بعد ازاں سیٹوں کی خیالی بساط پر ایک دوسرے سے داؤں جیتنے کی مہم شروع ہوگئی، پھر ذرا اور آگے چل کر فرقہ وارانہ تعصبات نے بھی اپنے کرشمے دکھائے۔ اس طرح مشکل سے بہم شدہ آپ کی جوہری قوت عمل تابکاری میں بکھرنے لگی جس کے دوران میں پہلے ایک گروہ الگ ہوا۔ پھر ایک اور گروہ نے الگ ہونے کے لیے داؤں پیچ لڑانے شروع کر دیے۔ اس طرح قوم کے لیے نو جماعتوں کے اتحاد نے جو مرکز اُمید پیدا کیا تھا، وہ متزلزل ہوگیا۔

سوچنے کا بڑا معاملہ یہی تھا کہ قوم کو عرصہ سے کوئی مضبوط اور غیر مصنوعی اور غیر ڈرامائی قیادت نہیں ملی، اور آج تک کوئی ایک پارٹی یہاں ایسی موجود نہیں ہے جو تن تنہا برسر اقتدار آئے، اور آ ہی جائے تو مسائلستان کے خارزار میں سے تن تنہا بخیریت گذر سکے، ایسی مصیبت کی ماری قوم کے سامنے جب قومی اتحاد رُونما ہوا تو یہ دیرینہ مایوسی، جو کبھی اسے غیر موزوں قوتوں کی بیعت کر لینے پر مجبور کر دیتی تھی، کبھی اُسے جمود یا اضطراب میں مبتلا کر دیتی تھی، پہلی مرتبہ اُمید سے بدل گئی۔ لوگوں کی اکثریت نے بھرپور اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو قومی اتحاد سے وابستہ کیا۔ اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اس متحدہ قیادت کے ایک اشارے پر وہ لاٹھیاں گولیاں کھانے اور جان و مال کا ایثار کرنے پر تیار ہوگئے۔ ہماری سیاسی کہانی جب اس کلائمکس تک پہنچی اور اس کا میڈین نتیجہ نکلنے کا واضح اشارہ پیدا ہوگیا تو کہانی کا ہیرو بننے والی اجتماعی قیادت اسٹیج چھوڑ کر پردے کے پیچھے چلی گئی اور اُن کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ تماشائی حیران کہ پردے کے آگے کا اصل ڈرامہ تکمیل سے پہلے ہی ختم ہوگیا، اور پردے کے پیچھے ایک کربناک ڈرامے کا آغاز ہوگیا۔

کیا کسی لیڈر نے یہ سوچا کہ کیا مقام حاصل ہوا تھا اور اسے کس سرسری انداز سے کھو دیا گیا ہے۔ لیڈر اور پارٹیاں برسوں کی تگ و تاز سے اس مرتبے پر پہنچتی ہیں کہ ان کی پکار پر قوم متحرک ہو سکے۔ یہ مقام تمام عہدوں اور نشستوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ یہ مقام آپ کو حاصل ہوا اور آپ نے اس کا حق ادا کرنے کے بجائے، اسے بالکل طفلانہ طریق سے کھو دیا۔ ہر کسی نے نہایت بچگانہ انداز سے

اُمیدیں یہ لگالیں کہ عوامی حمایت و تائید کی جو شاندار فصل لہلہا رہی ہے، اُسے وہ تنہا کیوں نہ کاٹ لے جائے۔ ایسے خواب دیکھنے والوں کے سامنے جب اُلٹی تعبیر آئے گی، تب انہیں سیاست کا وہ سبق ملے گا جو ایک بصیرت مند لیڈر تاریخ اور سماجی علوم اور عوامی نفسیات کی روشنی میں سیاست کاری کا آغاز کرنے سے پہلے جانتا ہے۔

مقصودِ گذارش نہ گستاخی ہے نہ تحقیر! اپنی شدتِ احساس کے زیرِ اثر یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ ابھی تلافیٔ مافات کا کچھ موقع باقی ہے۔ موقع یہی ہے کہ آپس میں اتحاد اور تعاون کی راہیں نکالی جائیں۔ سیاست کاری کا ایک یہی راستہ نہیں ہے کہ جو بھی حکومت ہو، آپ اپوزیشن کے محاذ پر رہ کر دُور ہی دُور سے اس کا تماشا کرتے رہیں اور اسے چلانے والوں کو یا عوام کو جو مشکلات اور پیچیدگیاں پیش آئیں، ان کے گراف بنا بنا کر اندازہ کیا جائے کہ کب کھیل ختم ہوتا ہے اور کب میدان ہمارے ہاتھ آتا ہے۔ کیا یہ صورتِ حالات آپ کے سامنے واضح نہیں کہ سماج دشمن اور تخریبی عناصر بار بار امن و امان کو تہ و بالا کرتے اور قومی املاک کو برباد کر رہے ہیں؟ کیا آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ باہر سے کس طرح رخنہ اندازیاں ہو رہی ہیں؟ کیا آپ پر روشن نہیں ہے کہ کمیونسٹ عنصر کی چلت پھرت بڑھ گئی ہے اور اُن کی کلیدی شخصیتیں ایک طرف زیرِ زمین ساز باز کر رہی ہیں اور دوسری طرف بالائے سطح مختلف راستوں سے اپنے ہاتھ دکھا رہی ہیں؟ اس وقت اگر آپ سب مل جل کر اسلامی نظام کی آمد کا (اور ضمناً جمہوریت کا) راستہ تیار نہیں کر لیتے تو خدانہ کرے، اس کوتاہی کا حساب چکانے کے لیے مشیتِ الٰہیہ ایک سوشلسٹ انقلاب کا بل ڈوزر بھی آپ کے سروں پر سے گزار سکتی ہے۔

یہ تو آپ کی اور ملک کی خوش قسمتی ہے کہ قبل اس کے کہ اسلامی سوشلزم کا انجن سائنٹیفک سوشلزم کی گاڑی کو کھینچ کے آگے لے آتا، ایک ایسی قوت میدان میں آگئی جو نہ صرف نیت کے لحاظ سے اسلام کا غلبہ چاہتی ہے۔ بلکہ عملاً بھی امکانی تدبیریں کر رہی ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ضرور ہے، مگر وہ اس قسم کا موقع فوراً ہی دو بار فراہم نہیں کر سکتی۔ وہ اگر کرے بھی تو ایک لمبے عرصے تک پہلے یہ سبق پڑھائے گی کہ اس طرح کا موقع پیدا ہو تو کسی قوم کے رہنماؤں کو کیا کرنا چاہیے۔ اب اگر اس موقع کو ضائع کرنے ہی پہ آپ تُلے ہوئے ہوں تو اس اندیشے کو ضرور سامنے رکھیں کہ اگر اسلام کے لیے کچھ

کرنے کی موجودہ کوشش ناکام ہوگئی تو پھر قانون کے ردِّ عمل کے تحت کوئی نہ کوئی مخالف اسلام قوت بھرپور جذبۂ انتقام کے ساتھ اُبھرے گی۔ اُس وقت اگر آپ دوڑے دوڑے اتحاد کی پناہ گاہ بنانا بھی چاہیں گے تو نہ بنا سکیں گے۔

براہِ کرم تاریخ کی جبین کی سلوٹوں کو دیکھیے کہ وہ کن امکانات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اسلام غربت کا کیا حل پیش کرتا ہے؟

آج کے اہم سوال کا مفصل جواب

اسلام اور معاشی تحفظ

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ

عبدالحمید صدیقی

•

مدلّل انداز ——— مستند حوالے

صفحات: ۱۶۷ بڑا سائز

قیمت: ——— ۹/- روپے

اخوان المسلمون

کی

داستانِ صبر و عزیمت

رُوداد ابتلاء

احمد رائف

ترجمہ

خلیل حامدی

•

اُن نوجوانوں کی داستان جن پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے گئے ——— مگر وہ پھر بھی کلمہ حق بلند کرتے رہے۔

صفحات: ۲۸۸ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت: ——— ۱۰/- روپے

البدر پبلی کیشنز - ۴۰-بی - اُردو بازار لاہور